الایام: مجلس برائے تحقیق اسلامی تاریخ و ثقافت، کراچی جلد: ۱، شمارہ: ۲، جولائی۔دسمبر ۲۰۱۰

مسئلہ فلسطین اور علّامہ اقبال

خدیجہ ناہید/ڈاکٹر نگار سجاد ظہیر

Abstract

Palestine is a complicated and burning issue of not only Middle East but world Politics. It has been a big question mark in international affairs for a century. It's not simply a political issue rather it has deep rooted ideological basis. Israel came into being after a long ideological, diplomatic and political effort. With setting dust of the 1st world war the idea of a Zionist state became more and more clear. It finally materialized in the form of Israel in May 1948.

What opinion did Allama Mohammad Iqbal (1873-1937) have on Palestine issue? Whether he considered it a simple political issue or he comprehend its ideological ties and the actual concept of "promised Land" as well. The following paper discusses this theme.

فلسطین شرقِ اوسط کا ہی نہیں، عالمی سیاسیات کا پیچیدہ ترین مسئلہ ہے اور بین الاقوامی امن کے لیئے سوالیہ نشان بھی۔ اس مسئلہ کا آغاز اس وقت ہوا جب خالص عرب علاقوں (یعنی فلسطین) میں ایک یہودی ریاست قائم کرنے کے صیہونی منصوبہ پر عمل درآمد شروع کیا گیا۔ اسرائیل کا قیام مئی ۱۹۴۸ء میں ایک طویل نظریاتی، سفارتی، اور سیاسی کوششوں کے بعد عمل میں آیا، اس وقت علامہ اقبال کے انتقال کو دس برس کا عرصہ گذر چکا تھا گویا وہ آواز بند ہوچکی تھی، جو اگر زندہ ہوتی تو اس حادثۂ فاجعہ پر امت مسلمہ کو ایک بار پھر جھنجھوڑ کر رکھ دیتی کیونکہ اپنی زندگی میں وہ اپنے کلام خطوط اور تقاریر کے ذریعہ ہندوستان کے اندر اور باہر مسئلہ فلسطین کو امتِ مسلمہ کا مسئلہ بنا کر پیش کرتے رہے اور اپنے انتقال سے قبل تک اپنا موقف پوری طاقت سے بیان کرتے رہے تھے۔

بیسویں صدی کا آغاز انقلابی تبدیلیوں کا آغاز تھا، عالمی طاقتوں (فرانس اور برطانیہ) کی استعماریت دنیا کو تیزی سے ایک ہولناک عالمی جنگ کی طرف ہانک رہی تھی۔ یہ وہ وقت تھا جب خود اقبال حصول علم کی غرض سے ۱۹۰۵ء سے ۱۹۰۸ء کے عرصہ میں جرمنی اور برطانیہ میں مقیم رہے، یہی وہ وقت تھا جب برطانیہ میں ایک صیہونی ریاست (یعنی اسرائیل) کے قیام کے سلسلہ میں ابتدائی کام کا آغاز ہو چکا تھا۔ جب اقبال یورپ پہنچے تو بتیس، تینتیس سالہ جوان تھے [1] دریافتِ یورپ کا ان کا پہلا تجربہ تھا۔ قیامِ یورپ کے دوران ان کا بیشتر وقت مغربی فلسفہ کے مطالعہ میں گذرا۔ وہ مغرب کی سیاسی و سفارتی تہوں میں پلنے والی صیہونی تحریک سے کس حد تک باخبر تھے اس بارے میں کچھ نہیں کہا جا سکتا کیونکہ اس حوالے سے ان کا اس دور کا کلام خاموش ہے۔ البتہ پہلی جنگ عظیم سے قبل اور بعد ہونے والی عالمی تبدیلیوں اور امتِ مسلمہ کی حالتِ زار پر ان کی گہری نظر رہی۔ عالمی منظر نامے پر ہونے والی ان تبدیلیوں کو ہم ان کی شاعری میں محسوس کرسکتے ہیں مثلاً ۱۹۱۲ء میں جب جنگ طرابلس ہوئی [2] تو انہوں نے فاطمہ بنت عبداللہ پر نظم لکھی۔ ۱۹۱۳ء میں انہوں نے محاصرہ ادرنہ پر نظم لکھی۔ ترکوں کے ساتھ عربوں کی غدّاری، جس کی وجہ سے پہلی جنگ عظیم میں خلافتِ عثمانیہ شکست سے دوچار ہوئی، پر انہوں نے ''دنیائے اسلام'' میں جن جذبات کا اظہار کیا ہے اس سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ وہ انگریزوں کی سازشوں سے خوب واقف تھے۔ کہتے ہیں:

حکمتِ مغرب سے ملّت کی یہ کیفیت ہوئی
ٹکڑے ٹکڑے جس طرح سونے کو کردیتا ہے گاز

اپنی ایک نظم ''طلوع اسلام'' میں وہ حجاز کے گورنر، شریف مکّہ کی ترکوں کے ساتھ غداری کو

اس طرح رقم کرتے ہیں:

حرم رسوا ہوا پیرحرم کی کم نگاہی سے
جوانانِ تتاری کس قدر صاحب نظر نکلے

جنگ عظیم اول کے دوران، برطانوی سازش کی بنیاد پر ہونے والی عرب بغاوت، پھر اعلان بالفور[3]، جنگ عظیم کے خاتمے پر، سلطنتِ عثمانیہ کے حصے بخرے، مقاماتِ مقدس کے تحفظ کا مسئلہ،الغائے خلافت ایسے پے در پے سانحات تھے جس نے امتِ مسلمہ کو سخت متوحش کر دیا تھا، ہر طرف بے یقینی اور مایوسی کی کیفیت چھا رہی تھی۔ جب جنگ عظیم کی تباہ کاریوں کی گرد ذرا بیٹھی تو دنیا نے دیکھا کہ ایک صیہونی ریاست (اسرائیل) کے قیام کا معاملہ کافی آگے جا چکا ہے۔

مغرب نے ہمیشہ اسے ایک خالص سیاسی مسئلہ کے طور پر دیکھا ہے[4] اور دنیا کو بھی یہی باور کرایا گیا ہے کہ یہ ایک سیاسی مسئلہ ہے جس کا کوئی سیاسی حل تلاش کیا جاسکتا ہے۔ لیکن یہ محض نصف سچائی ہے، مکمل سچائی یہ ہے کہ اسرائیل کے قیام کے پیچھے توراۃ کی تعلمات ہیں۔ یہ تعلیمات وہ نظریاتی بنیادیں فراہم کرتی ہیں، جن پر سیاسی اور سفارتی کوششوں سے بالاخر ایک صیہونی ریاست قائم کرلی گئی۔ یہودی اعتقاد کے مطابق اور عیسائیوں کا بھی یہی عقیدہ ہے کہ فلسطین اُس ''ارضِ موعود'' (Promised Land) کا حصہ ہے جس کا تذکرہ، ان کی مذہبی کتاب توراۃ (عہدنامۂ عتیق OLD TESTMENT) میں کیا گیا ہے اور جس پر یہودی (اور پروٹسٹنٹ عیسائی بھی) اعتقاد رکھتے ہیں۔

پہلے یہ دیکھ لینا چاہئے کہ توارۃ میں 'ارض موعود'' کا کیا تصور پیش کیا گیا ہے۔ کتاب پیدائش کے بارھویں باب میں آتا ہے:

> ''اور خداوند نے ابراہیم ؑ سے کہا کہ تو اپنے وطن اور اپنے ناتے داروں کے درمیان سے اور اپنے باپ کے گھر سے نکل کر اس ملک میں جا جو میں تجھے دکھاؤں گا اور میں تجھے ایک بڑی قوم بناؤں گا اور برکت دوں گا اور تیرا نام سرفراز کروں گا سو تو باعثِ برکت ہوا، جو تجھے مبارک کہیں ان کو میں برکت دوں گا اور جو تجھ پر لعنت کرے اس پر میں لعنت کروں گا اور زمین کے سب قبیلے تیرے وسیلے سے برکت پائیں گے۔'' (بائبل، کتاب پیدائش، باب ۱۲، آیت (Verse)۱)
>
> ''اور ابراہیم اس ملک سے گزرتا ہوا مقام سکم میں مورہ کے بلوط تک پہنچا۔ اس

وقت ملک میں کنعانی ۶ رہتے تھے۔تب خداوند نے ابراہیم کو دکھائی دے کر کہا کہ یہی ملک میں تیری نسل کو دوں گا۔"(بائبل ،کتاب پیدائش ،باب ۱۲، آیات ۶۔۷)

تیرھویں باب میں آتا ہے:

"خداوند نے ابراہیم سے کہا جبکہ لوط اس سے جداہو چکا تھا کہ اپنی آنکھ اٹھا اور جس جگہ تو ہے وہاں سے شمال اور جنوب ،مشرق اور مغرب کی طرف نظر دوڑا،کیونکہ یہ تمام ملک جو تو دیکھ رہا ہے میں تجھ کو اور تیری نسل کو ہمیشہ کے لیے دوں گا ،اور میں تیری نسل کو خاک کے ذروں کی مانند بناؤں گا۔"(بائبل ،کتاب پیدائش ، باب ۱۳، آیات ۱۴ تا ۱۷)

سترھویں باب میں آتا ہے:

"اور میں اپنے اور تیرے درمیان اور تیرے بعد تیری نسل کے درمیان ان کی سب پشتوں کے لیے اپنا عہد جو ابدی عہد ہوگا ،باندھوں گا تاکہ میں تیرا اور تیرے بعد تیری نسل کا خدا رہوں۔اور میں تجھ کو اور تیرے بعد تیری نسل کو کنعان کا تمام ملک جس میں تو پردیسی ہے ،ایسا دوں گا کہ وہ دائمی ملکیت ہو جائے۔"(بائبل ،کتاب پیدائش ،باب ۱۷، آیات ۷۔۸)

توراۃ میں "ارض موعود" (Promised Land) کا حدود اربعہ بھی مذکور ہے۔کتاب پیدائش کے پندرہویں باب میں ہے:

"اسی روز خداوند نے ابراہیم سے عہد کیا اور فرمایا کہ یہ ملک دریائے مصر سے لے کر عظیم دریائے فرات تک میں نے تیری اولاد کو دیا ہے۔"(بائبل، کتاب پیدائش ، باب ۱۵، آیت ۱۸)

یہی بات خصوصیت کے ساتھ حضرت یعقوبؑ کے لیے کہی جو تمام بنی اسرائیل کے جد ہیں۔

"اور یہ ملک جو میں نے ابراہیم اور اسحاق کو دیا ہے ،سو تجھ کو دوں گا اور تیرے بعد تیری نسل کو بھی یہی ملک دوں گا۔"

توراۃ محرفہ کی مذکورہ بالا آیات اور اس جیسی دیگر آیات ہی وہ نظریاتی بنیادیں فراہم کرتی

ہیں، جن کے سہارے یہودیوں کی طرف سے ہی نہیں بلکہ عیسائیوں کی طرف سے بھی فلسطین میں ایک ملک کا دعویٰ کیا جاتا ہے ،اس کے برخلاف مسلمان (خواہ عرب ہوں یا غیر عرب) چونکہ یہ عقیدہ رکھتے ہیں کہ حضرت موسیٰ پر نازل ہونے والی توراۃ تحریفات کا شکار ہو چکی ہے ،نیز قرآن میں بیان کیے جانے والے بنی اسرائیل کے بارے میں بیانات ،اس کے برعکس ہیں، لہٰذا مسلمانوں کے لیے یہ عقیدہ قابل قبول نہیں، عرب ، اسرائیل ٹکراؤ کی یہی نظریاتی بنیاد ہے ،جس کا کوئی سیاسی حل سوائے اس کے نہیں کہ یا تو عرب ،اسرائیل کے آگے شکست تسلیم کر کے، دریائے فرات سے لے کر دریائے نیل تک کا علاقہ خالی کر دیں اور یہودی اپنے ''ارض موعود'' کا مقدس علاقہ حاصل کر لیں جس کو حاصل کرنا ان کا مذہبی فریضہ بھی ہے اور یا پھر عرب ، ان سے لڑیں یہاں تک کہ یہود فلسطین چھوڑ کر نکل جانے پر مجبور کر دیے جائیں ،اور یہ کام (یعنی جہاد) اس وقت تک موثر نہیں ہو سکتا جب تک کہ مسلمان اپنی صفوں میں اتحاد قائم نہ کریں۔

اس سلسلہ کی ایک اور دلچسپ حقیقت یہ ہے کہ یہودیوں کو متحد کر کے فلسطین میں بسانے کی صیہونی تحریک کا بانی ایک یہودی تھیوڈور ہرتسل (Theodor Hertzel) کو سمجھا جاتا ہے ،لیکن حقیقت یہ ہے کہ یہودیوں کو متحد کر کے ایک ملک میں آباد کرنے کی فکری بنیاد عیسائیوں نے فراہم کی۔آج اسرائیل کو سب سے زیادہ معاونت فراہم کرنے والے امریکی اور یورپی عیسائی ہیں۔ہونا تو یہ چاہئے تھا کہ عیسائی ،یہودیوں سے سخت نفرت کرتے (اور کیتھولک عیسائی کرتے بھی ہیں) کیونکہ یہ یہودی ہی تھے جنھوں نے حضرت عیسیٰ کو جھٹلایا اور انہیں صلیب پر چڑھایا۔

اصل بات یہ ہے کہ جب قرن وسطیٰ کے آخری سالوں میں عیسائیوں میں اصلاحات کا دور چلا تو مارٹن لوتھر کی تحریک کے نتیجے میں عیسائیوں کا پروٹسٹنٹ فرقہ وجود میں آیا ،یہ فرقہ اللہ اور بندے کے درمیان پادری کے وسیلہ کو نہیں مانتا۔ان کا ماننا یہ ہے کہ ہر شخص کو کتاب مقدس پڑھنے کا حق حاصل ہے ،عیسائیوں کے خیالات میں یہ تبدیلی صلیبی جنگوں کی وجہ سے آئی تھی ، جس کے دوران انھوں نے دیکھا کہ مسلمان بغیر کسی واسطے وسیلے کے قرآن پڑھتے ہیں۔ مارٹن لوتھر نے کتاب مقدس کا انگریزی اور جرمنی زبان میں ترجمہ کیا۔یہی وجہ ہے کہ پروٹسٹنٹ فرقہ جرمنی اور برطانیہ میں تیزی سے پھیلا۔توراۃ سے براہ راست رجوع کرنے کے نتیجے میں انہیں ''ارض موعود'' (Promised Land) کے بارے میں حضرت ابراہیم اور حضرت یعقوب کے ساتھ کیے جانے والے آسمانی عہد کا علم ہوا، اور وہ اس بات کے قائل ہوئے کہ فلسطین یہودیوں کی سرزمین ہے ۔چنانچہ عرب مسلمانوں کو فلسطینی بلکہ ارض موعود کے تمام

علاقوں سے نکال باہر کرنا ان کے مذہبی عقیدے کے مطابق جائز ہی نہیں، بلکہ ضروری اور لازمی بھی ہے ۔یاد رہے کہ کیتھولک فرقہ کے یہ عقائد نہیں ہیں۔ان کا کلیسا ،یعنی رومی کلیسا ہمیشہ یہودیوں اور ان کی دعوت پر لعنت کرتا رہا۔ان کی کئی تنظیمیں محض معاشرے کو یہودیوں کے وجود سے پاک کرنے کے لیے بنائی گئیں جس کی سرپرستی پاپائے روم کیا کرتا تھا، اسی بناء پر فرانس ،برطانیہ ،اسپین اور جرمنی سے یہودی بڑی تعداد میں نکالے گئے ،کیونکہ کیتھولک عیسائی ،یہودیوں کی بابت یہ عقیدہ رکھتے تھے کہ اللہ کی پیدا کردہ مخلوقات میں خبیث ترین اور شریر ترین مخلوق یہودی ہیں، جلاوطنی کا یہ سلسلہ تیرھویں صدی عیسوی سے شروع ہو کر پندرہویں صدی تک چلا ۔یہ صدیاں دو بڑے عیسائی فرقوں یعنی پروٹسٹنٹ اور کیتھولک کے مابین تصادم کی خونریز صدیاں ہیں۔

"جس زمانے میں ——— خصوصاً انیسویں صدی میں .....امریکا اور برطانیہ میں پروٹسٹنٹ تحریک فروغ پا رہی تھی ،اس زمانہ میں صیہونی تحریک (Zionist Movement) کی فکری بنیادوں کا آغاز ہوا۔جس کے کچھ عرصہ کے بعد صیہونی تحریک کی بنیاد پڑ گئی۔جسے تھیوڈور ہرتشل کی صیہونی تحریک سے امتیاز کرنے کے لیے نصرانی صیہونی تحریک (Christian Zionism) کا نام دیا گیا۔مثلاً ملکہ وکٹوریہ کے عہد حکومت میں برطانیہ میں "دریافتِ فلسطین" کے لیے ایک فنڈ قائم کیا گیا جس کا نگران کنزبری (Canterbury) کے لاٹ پادری کو مقرر کیا گیا۔وہ برطانیہ کا بشپ اعظم تھا جسے توریت میں مذکورہ ارض موعود اور اس کی حدود کی دریافت کا کام سونپا گیا۔ے

امریکا میں بھی تھیوڈور ہرتشل کی صیہونی تحریک سے پہلے بلیک اسٹون (پیدائش ۱۸۴۱ء) نے فلسطین میں یہودیوں کی آبادکاری کا مطالبہ کر دیا تھا۔بلیک اسٹون کوئی یہودی نہیں بلکہ امریکا کا کٹر عیسائی تھا۔یہ Jesus is coming نامی ایک کتاب کا مولف ہے جو اپنے وقت کی بیسٹ سیلر تھی ،اس کتاب کے لگ بھگ دس لاکھ سے زائد نسخے فروخت ہوئے اور ۴۸ سے زائد زبانوں میں اس کا ترجمہ ہوا جس میں ایک ترجمہ عبرانی زبان میں بھی تھا۔بلیک اسٹون اپنی کتاب میں لکھتا ہے :

"تورات کی رو سے صیہونی مملکت کو بننا ہی ہے۔" ۸

گویا تھیوڈور ہرتشل (یہودی) کی صیہونی تحریک سے پہلے قیام اسرائیل کا مطالبہ کرنے والے عیسائی تھے نہ کہ یہودی۔اس کی وجہ جیسا کہ پہلے بھی بیان کی گئی یہ تھی کہ دونوں ہی (یعنی یہودی اور عیسائی) ایک ہی کتاب مقدس کے ماننے والے ہیں۔عیسائیوں کی مذہبی کتاب کل بائبل ہے (جس میں عہد نامہ عتیق اور عہد نامہ جدید دونوں شامل ہیں) لیکن یہودیوں کی مذہبی کتاب صرف عہد نامہ عتیق

ہے ، وہ عہد نامہ جدید کو مانتے ہی نہیں ۔ارض موعود کا ذکر بار بار عہد نامہ عتیق (یعنی توراۃ) میں آیا ہے ،کتاب مقدس پڑھنے والا عیسائی اپنی ابتدا عہد نامہ عتیق سے کرتا ہے ،لہٰذا ارض موعود کے سلسلہ میں اس کا بھی وہی عقیدہ بن جاتا ہے جو ایک یہودی کا ہے ۔یہی وجہ ہے کہ آج جو عیسائی ہیں، خصوصاً پروٹسٹنٹ ،وہ یہودیوں سے زیادہ صیہونی ہیں۔لہٰذا ریاست اسرائیل کی تشکیل اور محافظت کے علم بردار ہیں۔

صیہونیت کی جدید تحریک کا بانی تھیوڈور ہرتشل کو سمجھا جاتا ہے ۔یہ ویانا (اسٹریا) کا ایک نوجوان صحافی تھا، اس کا ایک کتابچہ The Jewish State،(Der Judenstaat)۱۸۹۶ء میں شائع ہوا جس میں اس نے ایک یہودی ریاست کے قیام کے عملی پہلوؤں کو پیش کیا تھا ۔اس کے اگلے سال اگست ۱۸۹۷ء میں اس نے سوئیڈن کے شہر بال (Basle) میں پہلی صیہونی کانگریس منعقد کی ۔جس نے اس تحریک کو عالمی سیاسی تحریک کی شکل دے دی ۔ہرتشل اپنی ڈائری میں لکھتا ہے :

"At Basle, I founded the jewish state, If I said this out loud today. I would be answered by universal laughter. If not in five years, certainly in 50, every one will know it-"۹

اس پہلی کانگریس کے بعد تھیوڈور ہرتشل نے ہر سطح پر یہودی ریاست کے قیام کے لیے اپنی سرگرمیاں شروع کر دیں ،اس سلسلہ میں وہ عثمانی خلیفہ عبدالحمید ثانی (۱۸۷۶۔۱۹۰۹ء) اور جرمن شہنشاہ ولیم ثانی سے بھی ملا ۔اس نے یہ ملاقاتیں ۱۸۹۸ء میں کیں لیکن عثمانی خلیفہ نے اپنی حیات میں فلسطین کا کوئی قطعہ زمین اسے دینے سے انکار کر دیا ۔تاہم اسے برطانیہ اور امریکا کے مقتدر طبقوں میں خاطر خواہ کامیابی ہوئی۔عیسائی صیہونیوں کی کوششیں بھی اس کا کام آسان کر رہی تھیں۔بلیک اسٹون نے جس کا تذکرہ پہلے بیان کیا گیا، اپنے رفقا کی مدد سے ایک یادداشت مرتب کی اور ۴۱۳ سے زائد اہم امریکی شخصیات سے اس یادداشت کی حمایت میں دستخط لینے میں کامیاب ہوا جن میں منتخب ارکان اسمبلی ،جج ، وکیل اور دیگر اہم شخصیات شامل تھیں ۔یہ یادداشت امریکی صدر بینجمن کی خدمت میں پیش کی گئی۔یادداشت میں اسرائیلی مطالبات کو تسلیم کرنے کی سفارش کی گئی تھی اور یہودیوں کو ارض فلسطین میں بسانے کے لیے امریکی صدر سے اپنا بھرپور تعاون اور اثر و رسوخ استعمال کرنے کی درخواست کی گئی تھی ،مذکورہ یادداشت ۱۹۱۹ء میں مرتب کی گئی۔

اس سے بھی دوسال قبل نومبر ۱۹۱۷ء میں اعلان بالفور (Balfour Declaration) ہو چکا تھا جس کا محرک جیمز بالفور تھا،وہ توریت پر پختہ یقین رکھتا تھا ۔اس وقت برطانیہ کا وزیر اعظم جارج لوئیس(George Louis) تھا جس نے اپنے متعلق صراحت سے کہا ہے کہ وہ صیہونی ہے اور توراۃ میں مذکور ''ارض مقدس'' پر پختہ یقین رکھتا ہے ۔ [۱۰]

علامہ اقبال جن برسوں میں یورپ میں تھے، ان برسوں میں یہ صیہونی تحریک ، جس نے پروٹسٹنٹ عیسائیوں اور یہودیوں کو یکجا کر رکھا تھا، چل رہی تھی ،یہ تو نہیں کہا جا سکتا کہ علامہ اقبال اسی وقت اس سے واقف ہو گئے تھے ،لیکن یہ ضرور ہے کہ اپنی فکری ارتقا کے آنے والے برسوں میں انہیں اس ''یکجائی'' کا اندازہ ہو گیا تھا ،ورنہ وہ فلسطینی عرب سے یہ نہ کہتے :

زمانہ اب بھی نہیں جس کے سوز سے فارغ
میں جانتا ہوں وہ آتش ترے وجود میں ہے
تری دوا نہ جینوا میں ہے نہ لندن میں
فرنگ کی رگِ جاں، پنجۂ یہود میں ہے
سنا ہے میں نے غلامی سے امتوں کی نجات
خودی کی پرورش و لذتِ نمود میں ہے (ضرب کلیم)

وہ یہود اور انگریز باالفاظِ دیگر یہودی۔ عیسائی گٹھ جوڑ کا معاملہ سمجھ گئے تھے ،اقبال نے اپنے خطوط اور بیانات میں اس کا جواب دیا تھا کہ یہودی فلسطین سے اپنی مرضی سے نکلے تھے، اور یہ ''خروج'' عربوں کے فتح فلسطین سے پہلے ہی ہو چکا تھا، تاہم اقبال نے یہودیوں کے اس دعوے کو تسلیم کرتے ہوئے ایک چبھتا ہوا سوال یہ اٹھا دیا کہ اگر فلسطین پر یہودیوں کا حق ہے تو عربوں کا حق اسپین اور سسلی اور دوسری یورپین مفتوحہ علاقوں پر کیوں نہیں ہوسکتا ہے، یہودیوں کا یہ دعویٰ ایسا ہی ہے جیسے ریڈانڈین امریکہ پر اورہُن ، گاتھ اور گال قومیں برطانیہ پر دعویٰ کردیں یا ہندوستان کے آریہ ایران اور روس پر دعویٰ کردیں کہ ان کا وطن اصلی واپس دیا جائے۔اقبال کی نظر میں یہ تاریخ پر ظلم اس کے ساتھ مذاق اور اسے اپنی مرضی سے بدلنے کی مضحک کوشش ہے، اگر انہیں وطن دینا ہی ہے تو جرمنی میں دینا چاہیے جہاں سے وہ نکالے گئے ، اپنے دعویٰ سے ہزار سالہ دست برداری اور خاموشی کے بعد یہودیوں کا نیا دعویٰ بالکل بے دلیل ہے، اور اس کے پیچھے مغرب کا ہاتھ ہے۔ [۱۱]

ہے خاک ِ فلسطین پہ یہودی کا اگر حق

ہسپانیہ پر حق نہیں کیوں اہل عرب کا؟
مقصد ہے ملوکیت انگلیس کا کچھ اور
قصہ نہیں تاریخ کا یا شہد و رطب کا	(ضرب کلیم)

برطانیہ نے پہلی جنگِ عظیم کے اختتام پر ترکوں کے ساتھ ہونے والے عہد نامہ سیورے کی رو سے مقاماتِ مقدسہ، فلسطین و شام کے لیئے مسلمانوں، یہودیوں اور عیسائیوں پر مشتمل ایک کمیشن قائم کرنے کا فیصلہ کیا تھا، ہندوستانی مسلمانوں کی نمائندگی کے لیئے اس میں اقبال کو شامل کرنے کی تجویز زیرِ غور آئی تھی اوراس کے لیئے اقبال سے دریافت کیا گیا تھا لیکن اقبال نے مالی مشکلات کی وجہ سے اس میں شمولیت سے انکار کر دیا تھا۔۱۲ اس کمیشن کے ارکان کی نامزدگی، ہئیت ترکیبی اور وظائف پر روشنی ڈالتے ہوئے ٹائن بی ''سروے آف انٹرنیشنل افیئرز'' (۱۹۲۵ء) جلد اول، مطبوعہ آکسفورڈ یونی ورسٹی پریس، لنڈن، ۱۹۲۷ء کے صفحہ ۳۶۵ پر لکھتا ہے:

''دفعاتِ انتداب کے مطابق (دفعہ ۱۳ و دفعہ ۱۴) فلسطین کے مقامات مقدسہ کے سلسلے میں (جن میں سے بعض مسلمانوں، مسیحیوں اور یہودیوں کے نزدیک یکساں مقدس ہیں) پوری ذمہ داری انتدابی مملکت نے سنبھال لی ہے اور وہ اس معاملے میں صرف جمعیت اقوام کے روبرو جواب دہ ہوگی۔ایک کمیشن اس غرض سے مقرر کیا جائے کہ وہ مقامات مقدسہ کے متعلق فلسطین کی تمام مذہبی ملتوں کے حقوق و دعاوی کا مطالعہ کرے، ان کی حدبندی اور تعین کردے۔ یہ کمیشن انتدابی مملکت مقرر کردے گی۔کمیشن کے ارکان کی نامزدگی کا طریقہ، کمیشن کی ہئیت ترکیبی اور اس کے وظائف جمعیت اقوام کی کونسل سے منظور کرائے جائیں گے۔اس کے بعد کمیشن مقرر کیا جاسکے گا یا وہ اپنے وظائف کا آغاز کرسکے گا۔'' ۱۳

مگر بعد میں حالات ایسی صورت اختیار کرتے گئے کہ یہ کمیشن بن ہی نہ سکا۔البتہ اقبال وقتاً وقتاً اپنے جذبات کا اظہار کرتے رہے:

جلتا ہے مگر شام و فلسطین پہ مرا دل
تدبیر سے کھلتا نہیں یہ عقیدہ مشکل	(ضرب کلیم)

پہلی جنگ عظیم کے خاتمے پر سلطنت عثمانیہ کے مفتوحہ علاقوں کے بٹوارہ اور ان کی نگرانی کے

لیے اتحادیوں کی ایک خودغرض اور مفاد پرست نام نہاد جمعیتِ اقوام (League of Nation)وجود میں آئی جس کا مورثِ اعلیٰ خود برطانیہ تھا۔اس نے جنگ کے ختم ہوتے ہی فلسطین کو اپنی ماتحتی میں لے کر وہاں فوجی حکومت قائم کر دی ،اب نہ شریف مکہ رہے نہ ان کی آزاد عرب ریاست کا سہانا خواب۔جس کا وعدہ خود اتحادیوں نے دوران جنگ ایک خفیہ معاہدہ ۱۴ کے ذریعہ عربوں سے کیا تھا اور اس یقین دہانی کے جواب میں عربوں نے ترکوں کے خلاف بغاوت کر دی تھی ،جس سے مشرقی محاذوں پر سلطنت عثمانیہ کی شکست کا سامان فراہم کیا تھا۔بہرحال جنگ کے خاتمے پر دولت عثمانیہ کا خاتمہ ہوا اور اس کے عرب علاقوں پر مسیحی برطانیہ اور فرانس کا تسلط قائم ہوا ،جنھوں نے جمعیت اقوام کے ذریعہ اپنی ذاتی اغراض کی تکمیل کا راستہ تلاش کر لیا۔۱۵ اقبال اسے کہیں ''داشتہ پیرکِ افرنگ'' کہتے ہیں کہیں ان کفن چوروں سے تشبیہ دیتے ہیں جو مشرق کو قبرستان بنا کر اسے بھی تقسیم کر لینے کے درپے رہتے ہیں۔

برفتد تاروشِ رزم دریں بزم کہن
دردمندانِ جہاں طرح نواند اختہ اند
من ازیں بیش ندانم کہ کفن دزدے چند
بہر تقسیم قبور انجمنے ساختہ اند

اسی جمعیت اقوام عالم کے آرٹیکل ۲۲ کی رُو سے فلسطین کو برطانوی انتداب کا حصہ قرار دیا گیا اور اس کے مستقبل کے فیصلے کو استصواب پر چھوڑ دیا گیا۔یہ برطانوی اور یہودی سازش کا حصہ تھا کہ اعلان بالفور ،جس کا تذکرہ صفحات گزشتہ میں کیا گیا ، اسی انتداب کا حصہ قرار دے دیا گیا۔اور آرٹیکل ۲ کی رُو سے فلسطینی علاقوں میں یہودی قومی وطن (National Home) کی تشکیل کو برطانوی ذمہ داری قرار دے دیا گیا اور آرٹیکل ۴ کی رُو سے فلسطین کے عرب علاقوں میں یہودیوں کی آبادکاری کی اجازت دی گئی آرٹیکل ۶ میں ضمناً عربوں کی تسکین کے لیے اتنا ضرور ذکر کر دیا گیا کہ یہودی قومی وطن سے عربوں کو کوئی نقصان نہیں ہو گا۔ ۱۶ اعلان بالفور میں لکھے جانے والے الفاظ کی کرشمہ سازیوں نے ایسا معلوم ہوتا ہے ،خطرناک صیہونی عزائم کی تفہیم کو دشوار بنا دیا اور دنیا سمجھتی رہی کہ فلسطین میں محض یہودیوں کے ایک قومی وطن کی بات ہو رہی ہے ،کسی سیاسی ریاست کی تشکیل کا مرحلہ درپیش نہیں ہے۔

اس کے بعد برطانیہ کی پالیسی اسی امر پر مرکوز رہی کہ فلسطین میں یہودیوں کی آبادکاری کو آسان بنایا جائے اور اس خطے سے اسلامی اثرات کو بتدریج ختم کیا جائے۔عربوں نے جلد ہی محسوس کر لیا کہ ان کی اکثریت کو اقلیت میں تبدیل کرنے کے منصوبے پر عمل درآمد ہو رہا ہے۔اس بے چینی نے

آگے چل کر عرب ، یہود فسادات کی شکل اختیار کر لی ۔۱۹۲۹ء میں ''دیوار گریہ''(Wailing Wall) کے سامنے عبادت کرنے پر عرب یہود فساد شروع ہو گیا ۔اس فساد پر یہودیوں نے برطانیہ سے شکایت کی ،برطانیہ نے فوری طور پر تحقیقاتی کمیشن مقرر کیا ،جس نے ۱۹۳۰ء میں اپنی رپورٹ پیش کی جس میں عربوں کو موردِ الزام قرار دیا گیا ۔دوسری طرف برطانیہ کی زیر سرپرستی یہود آبادکاری کا سلسلہ جاری رکھا گیا ۔عربوں کے لیئے فلسطین کا مسئلہ ان کی قومی زندگی کے حوالے سے زندگی اور موت کا معاملہ تھا، ایک ایسی سرزمین جس پر ان کا دیرینہ حق تھا اب غیر ملکی یہودیوں سے منصوبہ بندی کے تحت آباد کی جارہی تھی۔ پھر یہ صرف عربوں کا معاملہ نہیں تھا، قبلۂ اول بیت المقدس کی وجہ سے پوری امتِ مسلمہ کے لیئے معاملات تشوشناک رخ اختیار کر چکے تھے۔ اقبال کو بھی مسئلہ فلسطین پر شدید اضطراب تھا۔ ان کے خیال میں تنسیخ خلافت کے بعد مذہبی اور سیاسی نوعیت کا یہ پہلا بین الاقوامی مسئلہ تھا جسے تاریخی قوتیں سامنے لا رہی تھیں ۔ ۱۷

اگست ۱۹۲۹ء میں جبکہ فلسطین میں بڑے پیمانے پر مسلم کش فسادات ہوئے تو اس سے ہندستان کے مسلمانوں میں غم و غصہ پھیل گیا۔ ۷ر دسمبر ۱۹۲۹ء کو لاہور میں ایک جلسہ منعقد ہوا، جس کی صدارت اقبال نے کی۔ ہندوستان میں جتنی فلسطین کانفرنسیں ہوئیں سب میں اقبال کے مشورے اور ہمدردیاں شامل تھیں، علامہ نے فلسطین رپورٹ کے خلاف مسلمانان لاہور کی کانفرنس کے موقع پر ایک بیان دیا تھا، جس میں انہوں نے لکھا تھا کہ:

> ''عربوں کے ساتھ جو ناانصافی برتی گئی ہے، مجھے اس کا ایسا ہی شدید احساس ہے ،جیسا مشرق قریب کی صورت حال سے واقف کسی شخص کو ہوسکتا ہے، یہ مسئلہ مسلمانانِ عالم کو ایک موقعہ بہم پہنچاتا ہے کہ وہ پوری قوت سے اس امر کا اعلان کردیں کہ وہ مسئلہ جس کا حل برطانوی سیاستداں تلاش کررہے ہیں محض قضیہ فلسطین ہی نہیں بلکہ ایک ایسا مسئلہ ہے جس کا شدید اثر تمام دنیائے اسلام پر ہوگا۔ مسئلہ فلسطین کو اگر اس کے تاریخی پس منظر میں دیکھا جائے تو فلسطین ایک خالص اسلامی مسئلہ ہے، بنی اسرائیل کی تاریخ کی روشنی میں دیکھا جائے تو فلسطین میں مسئلہ یہود تو ۱۳ صدیاں ہوئی حضرت عمرؓ کے یروشلم میں داخلہ سے قبل ختم ہو چکا تھا، فلسطین سے یہودیوں کا جبری اخراج کبھی بھی عمل میں نہیں آیا بلکہ بقول پروفیسر ہوکنگ یہود اپنی مرضی اور ارادہ سے اس ملک سے

باہر پھیل گئے اور ان کے مقدس صحائف کا غالب حصہ فلسطین سے باہر ہی مرتب و مدون ہوا، مسئلہ فلسطین کبھی بھی عیسائیوں کا مسئلہ نہیں رہا، زمانہ حال کے تاریخی انکشافات نے ''پیٹر دی ہرمٹ'' کی ہستی ہی کو محل اشتباہ قرار دے دیا ہے''۔ ۱۸

حکومت برطانیہ نے ۱۹۳۱ء کے آخر میں لندن میں دوسری گول میز کانفرنس بلائی اس میں دوسرے مسلم زعماء کے ساتھ علامہ اقبال کو بھی مدعو کیا گیا، اسی زمانے میں علامہ کو بلاد مغرب سے تین دعوت نامے موصول ہوئے۔ پہلا دعوت نامہ اٹلی کی Learned Men's Academy of Rome کے صدر کی طرف سے تھا جس میں آپ سے روم میں تقریر کی درخواست کی گئی تھی۔ دوسرے انگلستان کی انڈیا سوسائٹی کے صدر سر فرانسس ینگ ہزبینڈ نے آپ کو دعوت دی کہ آپ سوسائٹی کی نائب صدارت قبول کرلیں، اور تیسرے فلسطین کے مفتی اعظم سید امین الحسینی نے اتحادِ عالم اسلام اور فلسطین کے مسائل پر غور کرنے کے لیے دسمبر ۱۹۳۱ء میں بیت المقدس میں ایک موتمر بلائی اور علامہ اقبال کو بھی مدعو کیا۔ ان وجوہ کی بناء پر آپ نے بلادِ مغرب کا رختِ سفر باندھا ۱۹ لندن سے واپسی پر حسب پروگرام ۲۰ مصر سے ہوتے ہوئے وہ فلسطین پہنچے جہاں یروشلم کی موتمر عالم اسلامی میں وہ ہندوستانی مسلمانوں کے نمائندے کے طور پر شریک ہوئے۔ اس موقع پر انہیں اس ارض مقدس میں قیام کرنے اور وہاں متعدد اسلامی ممالک مثلاً مراکش، مصر، یمن، شام، عراق، تیونس اور انڈونیشیا وغیرہ کے نمائندوں سے تبادلہ خیالات کا موقع ملا۔

علامہ اقبال ۶ دسمبر کی صبح فلسطین پہنچے تو ریلوے اسٹیشن پر ان کی پذیرائی کے لیئے مفتی امین الحسینی ۲۱ بذاتِ خود موجود تھے۔ فلسطین میں اقبال کا قیام نو روز رہا اس سفر کا اصل مقصد موتمر عالمِ اسلامی (اسلامی کانفرنس) میں شرکت تھی موتمر اس سے قبل بھی دوبار منعقد ہوچکی تھی۔ پہلی بار قاہرہ میں، دوسری بار مکہ میں ۱۹۲۶ء میں۔ تیسری کانفرنس کے داعی سید امین الحسینی، مفتی اعظم فلسطین تھے۔ جس میں ۲۷ ممالک یا علاقوں کے مندوبین شامل تھے۔ یوں تو عالمِ اسلام کے مخدوش اور پریشان کن حالات اس کانفرنس کے انعقاد کا سبب تھے لیکن کانفرنس کا سب سے اہم مقصد یہ تھا کہ مسلمانوں کو فلسطین پر یہودیوں کے ناجائز قبضے کے سنگین مسئلے کا احساس دلایا جائے اور صیہونی خطرے کے خلاف اتحادِ عالمِ اسلام کی تدبیر پر غور کیا جائے۔ ۲۲

مؤتمر کے ایک اجلاس میں تقریر کرتے ہوئے علامہ اقبال نے کہا ''انگریزوں کو بحیرہ مردار

کے مالی ذخائر اور دوسرے معاملات کا خیال ترک کر کے اخلاقی حیثیت سے اہل فلسطین کے ساتھ انصاف کرنا چاہیئے اور اس سلسلہ میں سب سے پہلا کام یہ ہے کہ بالفور کا اعلان منسوخ کیا جائے۔'' ۲۳ علامہ اقبال یہ سمجھتے تھے کہ مسئلہ فلسطین کا حل اتحاد عرب پر موقوف ہے۔ موتمر کے اجلاس میں ۱۴ر دسمبر ۱۹۳۱ء کو اپنے الوداعی خطبے میں انہوں نے کہا'' میرا عقیدہ ہے کہ اسلام کا مستقبل عرب کے ساتھ وابستہ ہے اور عرب کا مستقبل عرب کے اتحاد پر موقوف ہے، جب عرب متحد ہو جائیں گے تو اسلام بھی کامیاب ہو جائے گا۔ ہم سب پر واجب ہے کہ اس باب میں ساری قوتیں صرف کر دیں۔'' ۲۴

موتمر کے اجلاس سے واپسی پر روزنامہ سول اینڈ ملٹری گزٹ کے نمائندے نے ان سے گھر (لاہور) پر ملاقات کی اور فلسطین کے حوالے سے پوچھے گئے سوالات کے جواب میں علامہ اقبال نے کہا کہ موتمر شاندار طریقے پر کامیاب رہی اور یہ کہ'' مجھے یقین ہے کہ فلسطین کو یہودیوں کا وطن بنانے کی اسکیم بالآخر ناکام رہے گی'' ۲۵

اس موتمر میں شرکت سے یہ بات یقینی طور پر کہی جاسکتی ہے کہ علامہ اقبال کو صیہونیت کے عزائم کا پوری طرح اندازہ ہوا۔ موتمر میں منظور کی جانے والی قراردادوں اور خصوصاً اماکن مقدسہ کمیٹی کی تجاویز نے جس طرح کھل کر صیہونی خطرات کی شدت سے اسلامی دنیا کو آگاہ کیا، وہ اس کے لیے کافی تھا۔ ۲۶

یکم جنوری ۱۹۳۲ء کو ''سول اینڈ ملٹری گزٹ'' کے نمائندے سے گفتگو کرتے ہوئے فرمایا:'' ۔۔۔۔ مجھے معلوم ہوا کہ موتمر (عالم اسلامی) میں مندوبین اس (صیہونی) اسکیم کی شدت سے مخالفت کر رہے تھے، مجھے یقین ہے فلسطین کو یہودیوں کا وطن بنانے کی سکیم بالاخر ناکام رہے گی کیونکہ یہودی ہرگز عمدہ کسان نہیں بن سکتا۔'' ۲۷

علامہ کا یہ خیال تو وقت نے غلط ثابت کر دیا، انہیں اس قسم کا خیال غالباً اس لیئے بھی تھا کہ وہ سمجھتے تھے کہ یہودی بہت بڑی سود خور قوم ہے جو فلسطین جیسے غریب اور زرعی علاقہ میں آباد ہونا پسند نہیں کرے گی جہاں ان کے سودی کاروبار کے پنپنے کے آثار بہت کم ہیں۔ اصل مسئلہ یہ نہیں تھا کہ فلسطین غریب ملک تھا یا زرعی بلکہ اصل بات یہ تھی کہ فلسطین اس ''ارض موعود'' (Promised Land) کا جزو لاینفک تھا جس کا تذکرہ عہدنامۂ عتیق یعنی توراۃ میں کیا گیا ہے اور جس کی رو سے حضرت یعقوبؑ کی اولاد (بنی اسرائیل) کو یہ سارا علاقہ ان کے خداوند خدا نے عطا کیا ہے اور جس کا حقدار ان سے زیادہ کوئی نہیں۔ اور یہ کہ ان علاقوں میں آباد عربوں کو مار کر نکالنا ایک مذہبی فریضہ سے کم نہیں۔

فلسطین سے واپسی پر علامہ اقبال کی معرکتہ آلارا طویل نظم ''ذوق و شوق'' سامنے آئی جس کے اکثر اشعار فلسطین میں لکھے گئے، ماہرینِ اقبال نے اس نظم کو سفرِ فلسطین کا حاصل کہا ہے ۲۸ وسعت معنی، اور سوز و گداز کے لحاظ سے یہ نظم اقبال کی چند ممتاز نظموں میں شامل کی جاسکتی ہے۔ یہ نظم ملت اسلامیہ کے احیاء کے ذوق و شوق سے عبارت ہے اس نظم کی کیفیت میں شاعر کے تخیلات میں تاریخ کے منظر پر لاتعداد قافلے گذرتے ہیں اور قوموں کے عروج و زوال کے حوالہ سے مقامِ عبرت اور لمحۂ فکریہ مہیا کرتے ہیں۔۲۹

آگ بجھی ہوئی اِدھر، ٹوٹی ہوئی طناب اُدھر
کیا خبر اس مقام سے گذرے ہیں کتنے کارواں

کس سے کہوں کہ زہر ہے میرے لیئے مئے حیات
کہنہ ہے بزم کائنات، تازہ ہیں میرے واردات

کیا نہیں اور غزنوی کار گہہ حیات میں
بیٹھے ہیں کب سے منتظر، اہلِ حرم کے سومنات

ذکرِ عرب کے سوز میں، فکرِ عجم کے ساز میں
نے عربی مشاہدات، نے عجمی تخیلات

قافلۂ حجاز میں ایک بھی حسین نہیں
گرچہ ہے تاب دار ابھی گیسوئے دجلہ و فرات ۳۰

علامہ اقبال کو جب بھی موقع ملا، فلسطین کے حوالے سے انہوں نے اپنے موقف کا برملا اور دوٹوک انداز میں اظہار کیا۔اس سلسلہ میں کئی بااثر ملکی اور غیرملکی شخصیات سے ان کی خط و کتابت بھی رہی جس میں لیگ آف نیشنز کی فارک ہرسن کے نام کئی خطوط اس بات کا ثبوت ہیں۔۳۱ تیسری گول میز کانفرنس (منعقدہ دسمبر ۱۹۳۳ء) کے موقع پر بھی انہوں نے جمعیۃ الاقوام (League of Nations) کے استقبالیہ میں تقریر کرتے ہوئے کہا کہ ''برطانیہ کو چاہیئے کہ عالم اسلام سے دوستانہ تعلقات

استوار کرے اور یہ تب ہی ممکن ہے کہ فلسطین سے برطانوی اقتدار ختم کر کے اسے عربوں کے حوالے کر دیا جائے۔'' ۳۲

اس تقریب سے ایک روز قبل ۲۳ نومبر کو لیگ کے زیر اہتمام ایک جلسہ منعقد ہوا زیر بحث موضوعات میں فلسطینی عربوں کے حقوق کے تحفظ کی تدابیر زیر غور تھیں۔ اقبال کو اس اجلاس کی اطلاع تھی چنانچہ انہوں نے ایک تار کے ذریعہ اپنا پیغام بھیجا کہ فلسطین کے مسئلہ نے مسلمانوں کو سخت مضطرب اور پریشان کر رکھا ہے اگر اس قضیہ کا فیصلہ مسلمانوں کے حسب منشاء نہ ہوا تو اندیشہ ہے کہ نتائج سخت ناگوار ہوں گے۔ مجھے امید ہے کہ اگر آپ نے اپنی کوشش جاری رکھی تو فلسطین میں یہودیوں کا داخلہ روک دیا جائے گا اس طرح آپ برطانیہ اور دنیائے اسلام کے باہمی تصادم کو روک سکیں گے۔ اس سے چند روز قبل ۶ نومبر کو تقریباً اسی مضمون کا ایک تار علامہ اقبال وائسرائے کے نام بھیج چکے تھے۔ ۳۳

یہ وہ وقت تھا کہ جب فلسطین میں باہر سے لاکر یہودیوں کو بسانے کا عمل خاصا تیز کیا جا چکا تھا دسمبر ۱۹۳۳ء میں تیس ہزار یہودی باہر سے لا کر بسائے گئے ۱۹۳۴ء میں بیالیس ہزار، ۱۹۳۵ء میں اکسٹھ ہزار یہودیوں کو فلسطین میں آباد کیا گیا، اس پر فلسطینی عربوں نے شدید احتجاج کیا، اپریل ۱۹۳۶ء میں الحاج امین الحسینی کی قیادت میں چھ ماہ تک ہڑتال جاری رہی۔ پیل رائل (Peel Royal) کمیشن نے بالآخر برطانیہ پر واضح کر دیا کہ چونکہ عرب اور یہودیوں کو بیک وقت خوش نہیں رکھا جا سکتا لہٰذا فلسطین کا واحد حل اس کی تقسیم ہے، اس نے سفارش کی کہ آئندہ پانچ برسوں میں ہر سال بارہ ہزار یہودی باہر سے لا کر یہاں بسائے جائیں، نیز مسلم اکثریت کے علاقوں سے عربوں کا انخلا کر دیا جائے، عربوں کی صدائے احتجاج کو برطانیہ نے بربریت کے ساتھ کچلا۔ اکتوبر ۱۹۳۷ء میں ہائی عرب کمیٹی کو غیر قانونی قرار دے کر قائدین عرب کو جزائر میں جلاوطن کر دیا۔ ۳۴

پیل رائل کمیشن کی تقسیم فلسطین کی تجویز جب علامہ اقبال کے سامنے آئی تو وہ خاصے مضطرب ہوئے۔ ۲۷ جولائی ۱۹۳۷ء کو اس رپورٹ پر تبصرہ کرتے ہوئے اقبال فرماتے ہیں:

> ''یہ رپورٹ مسلمانان ایشیا کے لیے بڑی عبرتوں کی سرمایہ ہے۔ تجربے نے اس کو بہ تکرار واضح کر دیا ہے کہ مشرق قریب کے اسلامی ممالک کی سیاسی وحدت و استحکام عربوں اور ترکوں کے فوری اتحاد مکرر پر موقوف ہے .....مسئلہ فلسطین کے امکانات ممکن ہے مسلمانوں کو اس متحدہ انگریزی، فرانسیسی ادارہ جسے جمعیۃ الاقوام کا پُرشکوہ لقب دیا گیا ہے، کی رکنیت کی •

حیثیت پر غور کرنے پر مجبور کریں اور ایک ایشیائی جمعیۃ الاقوام کے قیام وترتیب پر مجبور ہوں۔۔۔۔موجودہ زمانہ ایشیا کی غیر عربی اسلامی سلطنتوں کے لیے بھی ایک ابتلا وآزمائش کا دور ہے کیونکہ تنسیخ خلافت کے بعد مذہبی اور سیاسی نوعیت کا یہ پہلا بین الاقوامی مسئلہ (فلسطین) ہے جو تاریخی قوتیں ان کے سامنے لا رہی ہیں۔''۳۵

علامہ اقبال کا یہ بصیرت افروز تبصرہ اس حوالے سے بہت اہم ہے کہ بالاخر اسلامی ممالک کی تنظیم کی بنیاد ،اسی مسئلہ فلسطین کی وجہ سے پڑی ،جب بیت المقدس کو آگ لگانے کا معاملہ سامنے آیا ۔ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ابتداء میں علامہ اقبال نے 'جمعیۃ الاقوام' (لیگ آف نیشنز)۳۶ سے کچھ توقعات وابستہ کرلی تھیں۔ لیگ کی صدر مارگریٹ فارک ہرسن کو انہوں نے خطوط بھی لکھے تھے اور مسئلہ فلسطین کے حوالے سے ان پر مسلمانوں کا موقف واضح کرتے رہے تھے۔تقسیم فلسطین کے حوالے سے پیل کمیشن کی سفارشات سامنے ائیں تو انہوں نے مارگریٹ فارک ہرسن کو خط میں لکھا!

''میں بدستور بیمار ہوں اس لیئے فلسطین رپورٹ پر اپنی رائے اور وہ عجیب و غریب خیالات اور احساسات، جو اس نے ہندستانی مسلمانوں کے دلوں میں بالخصوص اور ایشیائی مسلمانوں کے دلوں میں بالعموم پیدا کئے ہیں یا کرسکتی ہے، تفصیل سے تحریر نہیں کرسکتا۔۔۔۔۔۔۔۳۷

تمام بحث کو سمیٹتے ہوئے یہ کہا جاسکتا ہے کہ ہر دانشور کی طرح علامہ اقبال کی فکر نے ارتقائی مدارج طے کیے۔ سفر یورپ سے قبل وہ ہمیں ایک ایسے ہندوستانی شاعر کے طور پر نظر آتے ہیں، جو برطانیہ کی غلامی میں پلنے والی ہندوستانی قوم کے دکھوں کا مداوا کرنے کی تڑپ کا حامل ہے۔ انقلاب آفرین بیسویں صدی کے اوائل میں وہ یورپ کا سفر کرتے ہیں، جہاں انہیں صرف اسی بات کا موقع نہیں ملا کہ وہ اقوام مغرب کے سیاسی افکار سے آگاہی حاصل کریں بلکہ انہوں نے مختلف مغربی نظاموں کا بھی تجربہ حاصل کیا۔ مغربی جمہوریت ، بادشاہت، استعماریت، لادینیت، اور قومیت کا صرف دور سے بیٹھ کر مشاہدہ ہی نہیں کیا بلکہ ان کے عملی تجربے میں شامل رہے اور ان کے نتائج سے آگاہی حاصل کرتے رہے اور مختلف نشستوں میں اپنے مکالمات اور تقاریر کے ذریعے اپنے خیالات کا اظہار بھی کرتے رہے، بدقسمتی سے ان تقاریر یا مکالمات کا کوئی ریکارڈ محفوظ نہیں ہے ۳۸، لہذا پورے دعوئ سے یہ کہنا کہ وہ اس زمانے میں چلنے والی صیہونی تحریک ، جو صرف یہودیوں کی ہی نہیں بلکہ پروٹسٹنٹ

عیسائیوں کی بھی تحریک تھی، سے واقف نہیں تھے، ایک مشکل معاملہ ہے، یہ وہ سال ہیں جب مغرب ان بحثوں کی زد میں تھا اور اقبال جن کا واسطہ عموماً علمی حلقوں سے پڑتا تھا، ان بحثوں سے لاتعلق نہیں رہے ہوں گے، یہ دوسری بات ہے کہ براہِ راست صیہونی تحریک پر جو آگے چل کر مسئلہ فلسطین کی بنیاد بنی، انہوں نے اظہار خیال نہیں کیا، تاہم یورپ سے واپسی پر جب انہوں نے مسلم امہ کے مسائل پر لکھنا شروع کیا تو مسئلہ فلسطین بھی زیر بحث آیا، اس میں شدت اس وقت آئی جب گول میز کانفرنس کے بعد وہ خود بنفس نفیس یروشلم گئے، اور فلسطینیوں کے مسائل کا خود مشاہدہ کیا اور جہاں موقع ملا انہوں نے مسئلہ فلسطین کو دو ٹوک انداز میں پیش کیا اپنے انتقال سے دو تین سال قبل وہ عملی سیاست سے کنارہ کش ہوگئے تھے ۔ آخری دو سال علالت ہی میں گذرے ۱۹۳۵ء میں ان کی رفیقہ حیات کا انتقال ہوا۔ ۱۹۳۶ء میں منعقد ہونے والی فلسطین کانفرنس کی صدارت سے انہوں نے بوجہ علالت معذرت کرلی تھی لیکن ۱۹۳۷ء میں تقسیم فلسطین کی تجویز کے ساتھ ہی ان کا شدید ردعمل سامنے آیا اور اس کے ساتھ ہی غلام ہندوستان کی ایک توانا آواز ہمیشہ کے لیئے خاموش ہوگئی۔

حواشی و حوالہ جات

۱۔اگر ڈاکٹر وحید قریشی کی تحقیق پر اعتبار کرتے ہوئے علامہ اقبال کا سنہ ولادت ۱۸۷۳ء مانا جائے تو علامہ کی عمر یہی بنتی ہے۔(علامہ اقبال،حیات فکر وفن مرتب: ڈاکٹر سلیم اختر،مقالہ علامہ اقبال کی پیدائش از ڈاکٹر وحید قریشی،ص ۲۷، سنگ میل پبلی کیشنز،لاہور،۲۰۰۳ء)

۲۔طرابلس بیسویں صدی کے آغاز تک سلطنت عثمانیہ کا صوبہ تھا،ستمبر ۱۹۱۱ء میں اٹلی پچاس ہزار کی فوج کے ساتھ عثمانی سلطنت کے اس دور دراز علاقے پر حملہ آور ہوا،جہاں تک ترک افواج کا پہنچنا اس لیے دشوار تھا کہ درمیان میں مصر کا علاقہ پڑتا تھا۔جہاں برطانیہ کی عمل داری قائم ہو چکی تھی۔لہٰذا ترک بھیس بدل کر کسی نہ کسی طرح اٹلی پہنچے جس میں سرفہرست انور پاشا،مصطفیٰ کمال پاشا اور عصمت انونو تھے، انور پاشا نے اپنی حیرت انگیز قابلیت سے پورے ملک کو فوجی کیمپ بنا دیا۔یہی وہ دور ہے جس میں ترکوں کے جذبہ جہاد کا دنیائے اسلام میں غلغلہ ہوا اور ہندوستانی مسلمانوں میں بھی بیداری کی لہر آئی (ظہیر، نگار سجاد، جدید ترکی،ص ۲۴، قرطاس، کراچی، ۲۰۰۱ء)

۳۔''اعلان بالفور'' کو عالم اسلام میں ''رسوائے عالم'' اعلان کہا گیا ہے۔ یہ اعلان ایک خط میں کیا گیا تھا جس کے لیے انگلستان کی مجلس وزرا نے ارل جیمز بالفور کو اختیار دیا تھا کہ وہ برطانوی یہودیوں کے لیڈر لارڈ روسچائلڈ کو خط کے ذریعہ اطلاع دیں۔یہ خط ۲، نومبر ۱۹۱۷ء کو دفتر خارجہ سے لکھا گیا جس کا متن یہ ہے:

> ''ملک معظم کی گورنمنٹ کی جانب سے آپ کی خدمت میں یہ پیغام پہنچانے میں مجھے بے حد خوشی ہے جو صیہونی یہودی دیرینہ تمنا کے پورا کرنے کے لیے ہمدردانہ اعلان فرمایا ہے،اس کی تصدیق کابینہ نے بھی کر دی ہے اور وہ یہ ہے کہ:''ملک معظم کی حکومت فلسطین میں یہودیوں کے قومی وطن قائم کرنے کی تجویز کے حق میں ہے اور وہ اس مقصد کو حاصل کرنے کے لیے پوری پوری کوشش کرے گی لیکن یہ واضح رہے کہ کوئی ایسا قدم نہیں اٹھایا جائے گا جس سے فلسطین میں رہنے والی غیر یہودی قوموں یا دوسرے ممالک میں بسنے والے یہودیوں کے شہری یا مذہبی حقوق پر کسی قسم کا بُرا اثر پڑے۔آپ کا مخلص .....آرتھر جیمز بالفور۔''

اس اعلان کو صدر ولسن (مشہور چودہ نکات) اور فرانس واٹلی کی حکومتوں کی منظوری حاصل تھی بعد میں جب ۲۴، جولائی ۱۹۲۲ء میں انجمن اقوام (League of Nations) نے حکومت برطانیہ کو فلسطین پر قبضہ (mandate) کا اختیار دیا تو یہ خط انتداب(mandate) کی عبارت میں شامل کیا گیا،گویا دنیا کو یہ

پیغام دیا گیا کہ اعلان بالفور کو سرکاری اور بین الاقوامی طور پر قبول کر لیا گیا ہے اور اگر حکومت برطانیہ اس سلسلہ میں کامیاب نہ ہو سکے تو پھر دنیا کی عیسائی حکومتیں اس کام میں مدد دیں۔یہ خط معاہدے سیورے میں بھی شامل کیا گیا تھا(منشی عبدالقدیر ،"بیت المقدس" ،ص ۱۸۲۔۱۸۳، اردو اکیڈمی سندھ ،کراچی)

۴۔ Zionism, Definition and Early history by Mideast Web for Coexistence Middle East Resources, http/www.mideastweb.org

۵۔بنی اسرائیل کی تاریخ حضرت یعقوبؑ سے شروع ہوتی ہے، جو حضرت اسحاقؑ کے بیٹے اور حضرت ابراہیم کے پوتے تھے، حضرت یعقوب کا لقب "اسرائیل" تھا جس کے معنی ہیں عبداللہ یعنی اللہ کا بندہ۔چنانچہ تاریخ میں حضرت یعقوب کی اولاد "بنی اسرائیل" کہلائی ۔حضرت یعقوب کی چار بیویوں سے بارہ بیٹے تھے، انہی سے بنی اسرائیل کے بارہ قبائل کا ظہور ہوا ۔ان بارہ قبائل کا تشخص صدیوں تک قائم رہا ۔حضرت موسیٰ کے زمانے میں بھی بنی اسرائیل انہی بارہ قبائل میں منقسم تھے،لہٰذا ضرب کلیم سے صحرائے سینا میں ان کے لیے بارہ چشمے جاری ہوئے ۔جن کا ذکر قرآن مجید میں بھی ہے ۔حضرت موسیٰ نے ان میں تبلیغ و ہدایت کے لیے بارہ نقیب مقرر کیے ۔ان میں یہ نسلی اختلاف مابعد کے زمانوں میں بھی قائم رہا ۔حضرت یعقوب کا چوتھا بیٹا یہودا (Juda) تھا جس کے خاندان نے آگے چل کر سلطنت اور طاقت حاصل کی، لہٰذا کل بنی اسرائیل بالعموم یہودی کہلانے لگے اور آج تک یہی صورت حال ہے ۔

۶۔ کنعانی سے مراد عرب ہیں۔

۷۔ الحوالی، شیخ سفر عبدالرحمٰن ،فلسطین ، سچے اور جھوٹے وعدے کی کشمکش ،ص ۲۵

۸۔ ایضاً

۹۔ Zionism and the creation of Isreal, ;Pg 4 of 17, www.mideast.web.org

۱۰۔ فلسطین ، سچے اور جھوٹے وعدہ کی کشمکش ، الحوالی ، شیخ سفر عبدالرحمٰن ،ص ۲۵

۱۱ ۔ندوی، مولانا سیدابوالحسن علی، "نقوش اقبال" (عربی سے ترجمہ) شمس تبریز خان، (مجلس نشریات اسلام، کراچی ،۱۹۸۳ء) ص ۹۔۱۹۸۔

۱۲۔ سید مظفر حسین برنی، "کلیات مکاتیب اقبال" جلد۲،ص ۳۲۸۔۳۳۴ (اردو اکادمی ، دہلی ۱۹۹۱ء) اس کی ایک وجہ یہ بھی رہی ہوگی کہ اقبال طبعاً سہل پسند تھے،سفر اور نقل وحرکت سے انہیں بہت وحشت ہوتی تھی ظاہر ہے کمیشن میں شمولیت کا مطلب سال میں ایک بار ہی سہی فلسطین کا سفر تھا، جو اقبال پر گراں تھا۔

۱۳۔ برنی سید مظفر حسین "کلیات مکاتیب اقبال، جلد۲،ص ۳۳۴، ۳۳۵ (حاشیہ از محمد عبداللہ قریشی)اردو

اکادمی دہلی، ۱۹۹۱ء۔

۱۴۔ یہ خفیہ معاہدہ سائیکس۔ پیکو (Sykes-Picot agreement) کہلاتا ہے۔ سرکاری طور پر یہ معاہدہ ۱۶ر مئی ۱۹۱۶ء کو طے پایا جس میں ایک آزاد عرب ریاست کے قیام کا وعدہ کیا گیا تھا (تفصیل کے لیئے دیکھئے جارج لینزوسکی کی کتاب Middle East in the world Affair

۱۵۔ ندوی، سید حبیب الحق، فلسطین اور بین الاقوامی سیاسیات، ص ۳۷۹، کراچی، ۱۹۷۶ء

۱۶۔ ایضاً، ص ۳۷۹

۱۷۔ عقیل، ڈاکٹر معین الدین 'اقبال اور جدید دنیائے اسلام' (مکتبۂ تعمیر انسانیت، لاہور ۲۰۰۸)، ص ۲۶۷

۱۸۔ نقوشِ اقبال، ص ۱۹۶۔

۱۹۔ سید مظفر حسین برنی، ''کلیاتِ مکاتیب اقبال'' جلد۳، ص ۲۴۰ (حاشیہ)

۲۰۔ اس پروگرام کا تذکرہ انہوں نے اپنے بعض خطوط میں کیا ہے دیکھئے ''کلیات مکاتیب اقبال'' جلد۳، ص ۲۵۲، ۲۵۶۔

۲۱۔ مفتی اعظم فلسطین سید امین الحسینی (۱۸۸۸ء۔۱۹۷۴ء) فلسطین میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم قسطنطنیہ میں پائی، کچھ عرصہ انہوں نے جامعہ ازہر میں گذارا، پھر ترکی کے عسکری کالج میں فوجی تربیت مکمل کی اور عثمانی فوج میں ملازم ہوگئے۔ جب ۱۹۱۶ء کے بعد فلسطین میں بین الاقوامی حکومت قائم کرنے کی سازش کی گئی اور برطانیہ نے اس کا ہمنوا ہوکر اعلان کردیا کہ وہ فلسطین میں یہودیوں کے قومی وطن بنانے کو مستحسن خیال کرتا ہے تو وہ فلسطینی مسلمانوں کو منظم کرنے کی کوششوں میں مصروف ہو گئے برطانوی انتداب (MANDATE) سے پنجہ آزمائی کررہے تھے۔ ۱۹۲۱ء میں بیت المقدس کے مفتی مقرر ہوئے۔ ۱۹۲۲ء میں مؤتمر اسلامی کے صدر منتخب ہوئے اور پھر ۱۹۳۱ء تک انہوں نے فلسطینی مسلمانوں کو اس قابل کردیا کہ وہ انگریزی تسلط اور صیہونی خطرے کا پوری طاقت کے ساتھ مقابلہ کرسکیں۔ یہی نہیں بلکہ انہوں نے عالم اسلامی اور فلسطین کے مسائل پر غور کرنے کے لیے موتمر بھی بلائی۔

۱۹۳۳ء میں مفتی صاحب نے ہندوستان کا سفر کیا اور کچھ دن سیدنا طاہر سیف الدین کی قیام گاہ پر گزارے۔ پھر فلسطین پہنچ کر ۱۹۳۶ء میں برطانیہ کے خلاف جنگ آزادی کا اعلان کیا اور اسی سال عسکریت پسند عرب مجلس شوریٰ قائم کی جس کا مقصد فلسطین میں یہودیوں کی آبادی کو روکنا تھا۔ انگریزوں نے بہت چاہا کہ ان کو گرفتار کرلیا جائے لیکن وہ اس میں کامیاب نہیں ہوسکے۔ وہ لبنان میں سکونت پذیر ہوگئے اور پھر عراق چلے گئے جہاں انہوں نے عراق کو انگریزوں کے خلاف آمادہ پیکار کیا۔ دوسری جنگ عظیم کے دوران ان کی اقامت جرمنی میں رہی جہاں وہ اتحادیوں کے خلاف پروپگنڈہ کرتے رہے اور نازی حکومت کو وسط ایشیا کے معاملات میں مشورے دیتے رہے۔

جنگ عظیم کے خاتمے پر مفتی صاحب کو انگریزوں کے علاوہ اتحادیوں نے بہت تلاش کیا لیکن وہ ان کے ہاتھ نہ آسکے۔ البتہ فرانس میں دھوکے سے ان کو گرفتار کرلیا گیا۔انہوں نے کچھ دنوں تو قید کی صعوبتیں برداشت کیں لیکن کسی نہ کسی طرح وہاں سے نکل جانے میں کامیاب ہوگئے۔ جب قاہرہ پہنچے تو ان کا زبردست استقبال کیا گیا۔ انہوں نے اب مصر میں ''فلسطین عرب مجلس شوریٰ'' قائم کی لیکن وہاں ان کا رہنا دشوار ہوگیا تو وہ قاہرہ چھوڑ کر بیروت چلے آئے جہاں وہ ایک پناہ گزیں کی طرح زندگی گزارتے رہے۔ اسرائیلی مملکت کے قیام کے بعد بھی انہوں نے اپنی جدوجہد قائم رکھی اور صیہونیت کے خلاف پمفلٹ وغیرہ لکھتے رہے لیکن اب ان کا وہ اثر باقی نہ رہا تھا۔

فروری ۱۹۷۴ء کو مفتی صاحب اسلامی سربراہ کانفرنس میں شرکت کے لیے لاہور آئے تھے۔ اس کے چند ماہ بعد ۴رجولائی ۱۹۷۴ء کو عارضہ قلب کے نتیجے میں ان کا انتقال ہوگیا۔ مسلمانوں نے ان کو بیت المقدس میں دفن کرنا چاہا لیکن یہودیوں نے اس کی اجازت نہیں دی۔ (کلیات مکاتیب اقبال، جلد۲، ص۷۰۰۱ تا ۷۵۳)۔

۲۲۔ موتمر کی تفصیلات کے لیئے دیکھئے محمد حمزہ فاروقی 'سفرنامہ اقبال' (کراچی ۱۹۸۹ء) ص ۲۲۷۔ ۲۴۹۔

۲۳۔ محمد رفیق افضل، 'گفتارِ اقبال' (ادارۂ تحقیقات پاکستان، دانش گاہ پنجاب، لاہور ۱۹۸۶ء) ص ۲۳۴

۲۴۔ جاوید اقبال ''زندہ رود''، ص ۴۷۰، کراچی ۱۹۸۷ء نیز'' کلیات مکاتیب اقبال'' جلد۳، ص۲۔۷۵۱۔

۲۵۔ جاوید اقبال ''زندہ رود''، ص۴۷۲۔

۲۶۔ ایضاً، ص ۴۶۸۔

۲۷۔ ایضاً، ص ۱۴۵ نیز 'سفر نامہ اقبال' ص ۲۲۰

۲۸۔ ہاشمی، ڈاکٹر رفیع الدین'اقبال کی طویل نظمیں: فکری و فنی مطالعہ' (سنگ میل پبلی کیشنز، لاہور، ۲۰۰۴ء) ص ۱۵۳و بعدہ

۲۹۔ 'اقبال اور جدید دنیائے اسلام' ص ۲۶۷

۳۰۔ 'کلیات اقبال' (الحمراء، اسلام آباد ۲۰۰۰ء) ص ۵۶۱

۳۱۔ کلیات مکاتیب اقبال، جلد۳، ص ۵۔۲۸۳ نیز جلد۲، ص ۶۷۷۔

۳۲۔ 'اقبال اور جدید دنیائے اسلام' ص ۲۶۹ (بحوالہ "Times" لندن مورخہ ۲۵ نومبر ۱۹۳۳ء)

۳۳۔ ایضاً، ص ۲۶۹

۳۴۔ 'فلسطین اور بین الاقوامی سیاسیات' ص ۳۸۰

۳۵۔ ذوالفقار، ڈاکٹر غلام حسین، ترکی میں احیاء اسلام اور اقبال، (مقالہ در علامہ اقبال ،حیات فکر وفن، مرتب: ڈاکٹر سلیم اختر، ص۸۵۲، لاہور، ۲۰۰۳ء نیز عقیل، ڈاکٹر معین الدین'اقبال اور جدید دنیائے اسلام'،

ص ۲۶۷۔

۳۶۔ League of Nations 'جمعیۃ الاقوام' کا قیام پہلی جنگ عظیم کے بعد عمل میں لایا گیا تھا۔ اس ادارہ کا بنیادی مقصد عالمی امن کے قیام کے لیئے تیز تر اقدامات کرنا تھا، اس کا ہیڈ کوارٹر جنیوا میں تھا اس کے تاسیسی اراکین میں برطانیہ اور فرانس اور کچھ غیر وابستہ ممالک شامل تھے، امریکہ اس میں شامل نہیں تھا۔ جرمنی نے اس ادارہ کو ۱۹۲۶ء میں، سویت سوشلسٹ ریپبلک نے ۱۹۳۴ء میں جوائن کیا تاہم جرمنی اور جاپان نے ۱۹۳۳ء میں اس ادارہ کی رکنیت چھوڑ دی اور اٹلی نے ۱۹۳۶ء میں اس ادارہ کو چھوڑ دیا۔ بیشتر ممالک کے عدم اعتماد نے اس ادارہ کو رفتہ رفتہ غیر فعال بنا دیا یہاں تک کہ ۱۹۴۶ء میں دوسری عالمی جنگ کے بعد ''اقوام متحدہ'' (United Nations Organization) نے اس کی جگہ لے لی۔ (Min Lee Dictionary of Twentieth century history, Larousse, N.Y. 1994) p. 405

۳۷۔ اقبال اور جدید دنیائے اسلام، ص ۲۷۰۔

۳۸۔ مستنصر میر 'اقبال' (آکسفورڈ، کراچی ۲۰۰۶ء) ص ۱۳۲۔